لہو پکارے گا
اندر سروپ دت نادانؔ

اندر سروپ دت نادان

غالب میموریل ریلیف سوسائٹی نئی دہلی

شاعر : اندر سروپ دت ناداں

ولادت : ۲۷ر نومبر ۱۹۲۷ء

مقام : ڈھی دتاں، تحصیل تلہ گنگ، ضلع کیمبل پور (اٹک) پاکستان

پہلا شعری مجموعہ: غبارِ رنگ ۱۹۶۹ء

پتہ : B3/269، پشچم وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳

انتخاب و ترتیب : راج نرائن رازؔ

سرورق : بھنوٹ، ضیا فیضی

خوش نویس : رئیس الاسلام

"LAHOO PUKARE GA"
(URDU POETRY)
INDER SARUP DUTT 'NADAAN'

Rs. 40

طبع اوّل : چھ سو

ماہ و سال اشاعت: نومبر ۱۹۸۶ء

مطبع : عارض آفسٹ پریس ۱۲۳ شہزادہ باغ انڈسٹریل ایریا، اندرلوک، دہلی ۳۵

قیمت : چالیس روپے

ناشر : غالب میموریل ویلفیئر سوسائٹی، نئی دہلی

"لہو پکارے گا" کی طباعت اور پروسس،
پرنٹو اینڈ پروسس ۱۲۳۔ شہزادہ باغ انڈسٹریل ایریا فیز II اندرلوک دہلی ۳۵
کے ذریعے ہوئی۔

والدہ مرحومہ کے حضور میں

ترتیب

نظمیں :

غزلیں :

دیکھ کے یہ زہریلی فصلیں کیوں اتنے حیران ہو تم ؟
تم نے ہی تو اِن کھیتوں میں ناگوں کے پھَن بوئے تھے

نظمیں

تمہارے جسم سے جنگل کی باس آتی ہے
کہاں سے سیکھی ہیں یہ شہر داریاں یارو

عرضِ سخن

میں جانتا ہوں کہ یہ گھڑی شاعری کے حق میں بُری گھڑی ہے
عیاں ہے مجھ پر
کہ وہ زباں جو ہے میرے اظہار کا وسیلہ
خزاں سے دوچار ہو رہی ہے
مجھے خبر ہے
کہ میں نے جو کچھ بھی از رہِ شاعری کہا ہے
وہ بہرے کانوں پہ صرف ہوتے کو رہ گیا ہے
کوئی نہیں جس نے میرے شعروں پہ سر دُھنا ہے
ہزار واقف ہوں اس شکستِ سخن سے، پھر بھی
مجھے جو کہنا ہے، کہہ رہا ہوں
اور اپنے وقتوں کا جبر اُس روشنی کے ایما پہ سہہ رہا ہوں
جو اِک گُلِ تر کی مسکراہٹ سے پھُوٹ کر مجھ سے کہہ گئی ہے
کہ پورا کر اے شریکِ تخلیق، حُسنِ تخلیق کا تقاضا
نہ سوچ کیا تیرا حشر ہوگا!

فسادی

تھا سر پہ سورج
مگر اندھیرا
نہ جانے آکر کہاں سے میرے قریب کوندا
پھر ایک نیزہ
نگاہِ قاتل کی آگ پی کر
ہوا میں اُچھلا
صدائے قاتل کی گھن گرج نے
پھر آبروئے سکوت لُوٹی
"تجھے نہ چھوڑوں گا آج زندہ!"
" مجھے فسادی سمجھ کے شاید ہُوا ہے تیرا مزاج برہم
مگر میں مفسد نہیں ہوں بھائی ...."
مِرے تکلّم سے درد پھُوٹا
"تو کون ہو تم ؟"

زبانِ قاتل سے تیر چھوٹا

"میں شہرِ محنت کا بانکپن ہوں

میں راندۂ محفلِ سخن ہوں

میں گیت گاتا ہوں زندگی کے

بشر کی عظمت کے، روشنی کے

میں شہرِ ذلت کی ہر گلی سے گزر چکا ہوں

میں اُس خدا کو بھی جانتا ہوں

جو تیرے نیزے میں جلوہ گر ہے

وہ شخص بھی ہے مری نظر میں

جو تیرے اندر

محبتوں کے چراغ لے کر

نہ جانے کب سے بھٹک رہا ہے

وہ نیک انساں

جو میرے گیتوں کا دیوتا ہے ....."

ابھی ادھورا تھا گیت میرا

کہ چشمِ قاتل سے اشک ڈھلکے

ہوئے حمائل مرے گلے میں وہ دست و بازو

جو شہرِ ذلت کی آبرو تھے .....

ہزار بل کھا کے رہ گیا وہ مہیب نیزہ

خدائے وحشت نے ڈرتے ڈرتے یہ آدمیت کا جشن دیکھا

عظیم سورج کی روشنی میں ہوا اضافہ !

آتش فشاں

تمہیں جو کہنا ہے کھُل کر کہو مرے یارو
میں آشنائے زمانہ ہوں اور سمجھتا ہوں
کہ میرے گیتوں کی اس شہر میں بساط ہے کیا
وہ لوگ بھی ہیں برابر مرے کرم فرما
جو دے رہے ہیں ترے روز بد دعائے قضا
مرے خیال کی تپتی ہوئی جوانی کو
یہ سوچ کر کہ وہ آتش فشاں جواں کے لیے
پیام مرگ ہے، بُجھ جائے میرے اندر ہی
وہ آگ میری زباں کو ترستی رہ جائے
سُلگ رہی ہے برابر جو میری مٹی میں
مگر وہ لوگ جو برہم ہیں میرے گیتوں سے
یہ بات بھول گئے ہیں کہ جب کوئی شاعر
سُلگتے دل کو سجاتا ہے اپنے ہونٹوں پر
تو گونج اٹھتے ہیں وہ گیت، جن کی سچائی
کسی بھی جھوٹ کے پردے کو چیر سکتی ہے
تمہیں جو کرنا ہے کرتے رہو مرے یارو
مجھے یقیں ہے مرے گیت مر نہیں سکتے!

میری آنکھیں

میری اشک آلودہ آنکھیں
چوراہے کا
خونی منظر دیکھ رہی تھیں
اور اس لالہ زار کا ہادی
اپنی روپوشی کی خاطر
میری آنکھوں کو چھپانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا . . .

آج میں آنکھیں کھو بیٹھا ہوں
لیکن وہ احساس برابر دیکھ رہا ہے
جو آنکھوں کے زخموں نے بیدار کیا ہے !

ناؤ کاغذ کی

وہ گھر، جو دُور سے اِک مُرغزار لگتا تھا

اُسے قریب سے دیکھا تو دشتِ غم نکلا

فضا اُجاڑ سی ماحول میں اُداسی تھی

سموم یاس کی ہر سُو بلکتی پھرتی تھی

کچھ ایسی راگنی تھی ٹوٹے دل کے تاروں کی

فضا بنی ہوئی تھی رقص گہہ شراروں کی

جلوس چُپ کے، عجب دُکھ کی رَو میں چلتے تھے

خموش، اُداس، اندھیروں کے پرچموں کو لیے

وہ گھر، جو دیکھنے میں دلربا تھا، محکم تھا

حقیقتاً وہ سیہ گاہِ حسرت و غم تھا

نہ جانے کون سے وقتوں کی یادگار تھا وہ
نہ جانے کون سی تہذیب کا مزار تھا وہ

مکیں تھے اُس کے اُداسی کی زندہ تصویریں
کہ جشنِ زیست کے خوابوں کی اوندھی تعبیریں
اک عمر کاٹ چکے تھے وہ اس سیہ بن میں
بسی تھی خاک ہی، بس خاک اُن کے تن من میں
بدن کھنڈر تھے جوانی کے، نیم جان تھے وہ
زبانِ گویا کے ہوتے بھی بے زبان تھے وہ
عجیب خوف کا عالم تھا اُن کے چہروں پر
کسی شراپ کے نرغے میں تھے وہ موت نگر
کھُلے ہوئے تھے مگر شُترِ بے مہار نہ تھے
ہزار سامنے تھے پھر بھی آشکار نہ تھے
نہ مجھ سے دیکھی گئی ہائے بے لبسی اُن کی
کہ بندیوں سے بھی بدتر تھی زندگی اُن کی

جو آنکھ اُٹھائی تو اِک ناؤ بھی دکھائی دی
لپی جو اُس پہ لکھی تھی پڑھی نہ جاتی تھی
یہ ناؤ قبلہ و کعبہ تھی اُن قتیلوں کی
اسی کی چاکری پوجا تھی اُن اصیلوں کی
اسی پہ ختم تھا اُن کے شعور کا امکاں

اسی کی دُھول میں تھا اُن کی آگہی کا جہاں
حیات اُن کی تھی لیکن وہ اس سے ڈرتے تھے
ہزار بار اُسے فرشی سلام کرتے تھے
جواب میں کسی کونے سے اِک مہیب صدا
کچھ ایسی گونجتی سب پہ ہراس چھا جاتا
صد احترام کہ یہ ناؤ زندگی کی ہے
کرو سلام کہ یہ ناؤ زندگی کی ہے
جھُکو مدام کہ یہ ناؤ زندگی کی ہے

نظر کے سامنے تھا یہ طلسمِ ہوش رُبا
مرا خیال مگر اُس دیارِ ہوش میں تھا
اُٹھا رہا تھا جہاں یہ سوال ذہنِ رسا
یہ کیا فریب ہے؟ آخر یہ سلسلہ ہے کیا؟
یہاں کے باسیوں کا بھی کوئی خدا ہے کیا؟
جب اس خیال نے پہنا لباس لفظوں کا
تو اس مہیب صدا کا بھی رنگ اور ہُوا
بس اِک سوال یہی چار سمت سے اُٹھا
کہاں سے آیا ہے تازہ ہوا کا یہ جھونکا؟
ہماری کہنہ روایت پہ کس نے وار کیا؟
فضا نے جلد ہی دوزخ کا رُوپ دھار لیا
یہاں سے بھاگ، نکل! دل مرا پکار اُٹھا

چلا تو پاس ہی گھڑلی سی اک پڑی پائی
اُسے جو غور سے دیکھا تو ہلتی جُلتی تھی
سُنائی دی مجھے پھر ایک دُور کی آواز
اِدھر بھی دیکھ! اور درد حسیات کی پرواز
کہ زخم خوردہ ہوں میں بھی اسی روایت کا
دیا ہے جس نے تجھے آج درد کا تحفہ
مجھے خوشی ہے کہ یہ درد ابھی سلامت ہے
جو وہ رُکا تو سوال اس سے یہ کیا میں نے
یہ ناؤ کیا ہے؟ مرے دوست کچھ بتاؤ بھی!
جو داستانِ طلسمات ہے اسناؤ بھی!
مرے سوال پہ وہ گھٹری اس طرح سے کھلی
جو دیکھا سامنے اک آدمی کی صورت تھی
اگر کہوں تو یہ صدیوں پرانی چھانکی تھی
وہ جس نے وقت کے صحرا کی ریت پھانکی تھی
برستی آنکھوں سے لب اُس نے اس طرح کھولے
سنو! یہ ناؤ ہے کاغذ کی، دُور دریا سے
یہ جانتی نہیں طوفان کس کو کہتے ہیں
نہ اس نے موجِ حوادث کے خواب دیکھے ہیں
رہی ہے خشکیوں کی گود ہی میں محوِ خرام
مگر سفینے ڈبونے کا اس پہ ہے الزام

ایک کمزور لمحہ

میں آرزو کے صنم کدوں میں خراب ہو کر
یقیں کا زینہ اُتر رہا ہوں
ہیں خندہ زن مجھ پہ بُت پرانے
نئے خدا بھی ہیں مجھ سے برہم
ہے میری آنکھوں کے سامنے اک مہیب خندق
ہیں جس میں آباد خود یقینی نگلنے والے ہزاروں اجگر
جو میرے گرنے کے منتظر ہیں . . . .
مگر یہ اجگر
مری تجسس نواز فطرت سے بے خبر ہیں
کہ جس کے بَل پر
میں گِرتے گِرتے بھی ڈھونڈ لیتا ہوں زندگی کے حسیں سہارے

ٹھی دتّاں

میں نے بھی کچھ اینٹیں چُن کر
اُن پر اپنا نام لکھا ہے
آپ کی دلّی سے اب میرا بھی رشتہ ہے
لیکن میرے من کا پنچھی
اِن اینٹوں کے جادُو سے بیگانہ ہو کر
اب تک واگھا پار کی اُس بستی کے چکّر کاٹ رہا ہے
جس کو میرے پُرکھوں نے آباد کیا تھا
جس کو آدھی رات کی آزادی نے مجھ سے چھین لیا تھا !

آنگن

گاؤں کی مٹی
شہر میں آکر لُوٹ گئی تھی
اور وہ آنگن ڈھونڈ رہی تھی
جس کی خوشبو
اُس کے بوسیدہ آنچل میں بندھی ہوئی تھی
یہ زنجیر بھی رہ رہ کر اُس کے قدموں میں لُوٹ رہی تھی
کون سا سُکھ ہے جو اس گھر میں نہیں ہے ماں جی!
پھر یہ درد بھری آواز فضا میں گونجی
روک نہ مجھ کو میرے بیٹے
میرا رستہ دیکھ رہے ہیں تیرے پُرکھے
پَل دو پَل تو جی لینے دے مجھ کو اُس آنگن میں پگلے
جس کی لو میں بھٹک رہی ہے میری مٹّی!

تانڈو

آناً فاناً
آتی جاتی
رنگ برنگی
کاروں کی رفتار کا جادو ٹوٹ گیا ہے
لیکن اس رفتار کے ماتم سے بیگانہ

اک دیوانہ
روکی ہوئی کاروں کے آگے
اپنی دھن میں ناچ رہا ہے
اُس کے من پاتال نے ان لفظوں کا دامن تھام رکھا ہے
میرے کھیت مجھے لوٹا دو
ایک جھلک، بس ایک جھلک، اُس گم گشتہ بستی کی دکھا دو
جس کی پیار بھری مٹی میں کھیل کے میں پروان چڑھا تھا
جس کی نرم روی نے مجھ پر
جنّت کا در کھول دیا تھا!

میں آرہا ہُوں

رات میں اِک وادیٔ حیراں میں تھا محوِ سفر
ہمسفر کوئی نہ تھا پُر پیچ راہوں کے سِوا
سرد چٹانوں کے سینے بچھوؤں سے لیس تھے
اور بُوڑھے پیڑ سانپوں کی قبا پہنے ہوئے
کہہ رہے تھے اپنی آدم خوریوں کی داستاں
اس پہ چاروں سمت لہراتا ہوا قاتل دُھواں
ڈھونڈتا پھرتا تھا میری زندگانی کا زیاں
اور میں اُن حادثوں سے روشنی لیتا ہوا
جن سے وابستہ تھا میری زندگی کا ارتقا
بڑھ رہا تھا دھیرے دھیرے اُس ستارے کی طرف
جو جنوں کی آخری منزل کا پہرے دار تھا

بچھّو کی تلاش

صحنِ چمن کے ہنگاموں سے
کٹ کر جو اک سمت پڑا تھا
خاموشی کے طلسم سے جس نے
اپنے آپ کو ڈھانپ رکھا تھا
آج نہ جانے اُس گونگے کو
آکر کس بچھّو نے کاٹا
سوتے سوتے چیخ اُٹھا ہے

ـــ میرے گلشن کا یہ عالم
کیاری کیاری ۔ صحرا صحرا
گیتوں کے سینے میں خنجر
ہر سُو غم کا، یاس کا پہرہ
چاٹ گئی ہے بَیرن تتلی
دودھ کی ندیاں ۔ شہد کے دریا
مجھ سے یہ برداشت نہ ہو گا
میں اپنی تقریر کے بل پر
اس بَیرن کے پر کاٹوں گا
پر کاٹوں گا .....

آؤ اُس بچھو کو ڈھونڈیں
جس نے اِس گُونگے کو کاٹا

مُردار

صدیوں پہلے
اس دھرتی پر
ہوتی تھی اک ادبھت "چڑیا"
جس کی خاطر دھوپ میں جلتے
پھولوں سے بھی سُندر چہرے
جس کے سُکھ سنسار کی خاطر
ہر جانب تھے غم کے پہرے
جس کے نام پہ انسانوں کا
خون بہانا جُرم نہیں تھا
جس کی خاطر بستے گھر میں
آگ لگانا جُرم نہیں تھا
جو اس کی آواز کو سُن کر
سر دُھنتا تھا۔ لہراتا تھا
جاگیریں ملتی تھیں اُس کو
وہ درباری کہلاتا تھا

میری سوچ پہ کیوں لہرایا
آج اُسی مُردار کا سایا

دردخور

مسئلے
سانپوں کی صورت
پھن اُٹھائے
اہلِ غم کی سمت بڑھتے آرہے ہیں
اور اُن کے غم کی قسمیں کھانے والے
تیز طیّارے میں بیٹھے
اس جزیرے کی دِشا میں جارہے ہیں
جس کے تاجر
سُرخ ہونٹوں، تنِد پستانوں، سُنہری پنڈلیوں کی
چاندنی میں
بیچتے ہیں
سانپ سِدھ کرنے کے منتر!

اگر یہ سچ ہے

یہ راستہ تم نے خود چُنا تھا
تمہیں نے اس کو
نشاط گاہِ سفر کہا تھا
یہ بھیڑیے، یہ مہیب اجگر
لہو لہو جو پکارتے ہیں تمہارے قدموں کی چاپ سُن کر
نہ تھے تمہاری نظر سے اوجھل
یہ نیزہ نیزہ اُترتے سورج کی جان لیوا تمازتیں کہ جلا رہی ہیں بدن تمہارا
تمہاری دانست کی حدوں سے نہیں تھیں باہر
یہ زرد آندھی
جو وقت بے وقت سر اُٹھا کر
تمہارے قدموں کی بے پناہی کو ٹوکتی ہے
صلیب لے کر اُٹھی تھی اکثر تمہارے ذہنِ رسا کے اندر

تمہیں خبر تھی
کہ راستے میں ہے ایک وحشی مزاج دریا
جو موج در موج بند کرتا ہے راستہ حُسنِ جستجو کا
اور اُس پہاڑی پہ بھی برابر تمہاری نظریں جمی ہوئی تھیں
جہاں سے پڑتے ہیں روز و شب اس نشاط گاہِ سفر پہ پتھر
اگر یہ سچ ہے
تو پھر یہ شکوے، شکایتیں کیوں
یہ نوحہ خوانی، یہ رُوح فرسا حکایتیں کیوں
یقین رکھو کہ سینہ کوبی سے راستہ یہ نہیں کٹے گا
نہیں ہے کوئی یہاں جو تم سے شکست کی داستاں سُنے گا
اگر سُنے گا تو پہلے جی کھول کر ہنسے گا
پھر اپنے انداز میں کہے گا
یہ راستہ تم نے خود چُنا تھا!

مرقد کی سیاست

لو مان لیا ہم نے
لوگوں کی نگاہوں میں
وہ پیڑ بہت کچھ تھا
اور اُس کا گھنا سایا
جلتی ہوئی دھرتی پر
احسان تھا قدرت کا

لو مان لیا ہم نے
اُس پیڑ کے گرنے پر
بھونچال سا آیا تھا
پگھلے تھے وہ پیکر بھی
مشہور تھی دنیا میں
سنگین دِلی جن کی

لو مان لیا ہم نے
اُس لُطفِ مجسّم کی
مہکی ہوئی یادوں کا
ہر دل میں بسیرا ہے
اور اُس کے نہ ہونے کا
زخم آج بھی تازہ ہے

لیکن غمِ دوراں کو
اوڑھے ہوئے بیمارو
وہ زخم بھی دکھلاؤ
جس زخم کے ایما پر
سرگرمِ عمل ہو تم
مرقد کی سیاست میں

غیبی ہاتھ

دعا کرو
کہ یہ بادل
یہ جنگ کا بادل
بغیر برسے گزر جائے اُس بیاباں سے
جہاں ہزار ہا معصوم، بے گھروں کا ہجوم
اُس آستانے کی خاطر ذلیل و رُسوا ہے
جو کھو گیا ہے کہیں سازشوں کے جنگل میں

دعا کرو
کہ خدا آسمان سے بھیجے
اک ایسا ہاتھ
کہ جس کا اشارہ پاتے ہی
فنا کی گود میں سو جائے یہ حریفِ بقا
یہ آگ، آگ نحوست
یہ سر پھرا بادل
اور اُس ہجومِ ستم دیدہ کو امان ملے
جو نامرادیوں کی آندھیوں میں زندہ ہے

دعا کرو
کہ دعا پر تمہارا تکیہ ہے
مگر یہ بات بھی پیشِ نظر رہے یارو!
کہیں تمہاری طرح ہی نہ غرقِ عشرت ہو
خدا تمہارا
کہ آخر خدا تمہارا ہے!

سُورج پُترّ

پیاسی دھرتی چیخ رہی ہے
سُورج کے رتھ بان کی آنکھیں
جمی ہوئی ہیں
اُس تہذیب زدہ بستی پر
پیاس کی کھٹن ڈگر نے جس کا
جینا دوبھر کر ڈالا ہے
جس کا باسی
اپنے پُرکھوں کی رُوحوں کو
پانی دینا بھُول گیا ہے
پیاس کی آگ میں جلتے جلتے
سوچ رہا ہے
اس سنکٹ میں
سُورج پُتر کرن ہوتا تو وہ کیا کرتا
گنگا لانے کی خاطر سبھا گیرتھ بنتا
یا اُس دانو کی ڈیوڑھی میں
پانی بھرتا
قید ہے جس کے بندی گھر میں
پنگھٹ کے گیتوں کا سرگم!!

ایک نظم

رات کا جادو جواں تھا

اور وہ سب
اپنی اپنی اُمّتوں کا بوجھ کاندھوں پر اُٹھائے
ایٹمی ہتھیار بغلوں میں چھُپائے
برتری کا خواب آنکھوں میں سجائے
دَوڑتے ہی جا رہے تھے
رات کی سازش میں شامل قمقمے اُن کو برابر راستہ دکھلا رہے تھے
اور وہ کُتّے جو یم دُوتوں کا بخشا کھا رہے تھے
بھَونکتے ہی جا رہے تھے

اور دَوڑو ، اور دَوڑو ، اور دَوڑو ....

اور پھر اس دَوڑ کا وہ موڑ آیا
پیش خیمہ تھا جو تخریبِ جہاں کا
پھر ہُوا لاکھوں دھماکوں کے برابر اِک دھماکا
ہو گئی دو لخت دھرتی
اور دوزخ کی حکایت
بن کے اِک زندہ حقیقت
ہر نشانِ زندگی پر آگ کے مانند برسی
خاک ہو کر رہ گئی آدم کی بستی ....
اور اُس ناسُور نے اپنی لگائی آگ چاٹی
جو برابر برتری خواہوں کے ذہنوں میں پلا تھا
جس کے حق میں زہر تھا سُورج کا جلوہ !

لہو پکارے گا

میرا بچپن
گھر آنگن کی !
نرم فضا میں اُونگھ رہا تھا ____
جب وہ شہرِ جنوں کا بانکا
زخمستان کے روشن فردا کی راہوں میں
راتوں جاگا
اور فرازِ دار سے ہو کر ستلج کی لافانی لہروں کا ہو بیٹھا

آج یہ نصف صدی کا قصّہ
تحریروں اور تقریروں کے جنگل کی بے رحم ہوا سے
جان بچاتا
شہرِ سُخن میں آ پہنچا ہے
اور مری تخلیق کا دامن تھام کے مجھ سے پُوچھ رہا ہے
تیرے گیت ادھورے کیوں ہیں ؟

اور مِرے افکار کی آنکھیں
آگ کے دریاؤں سے ہو کر
اُس محفوظ جزیرے کی بے شرم جسارت دیکھ رہی ہیں
جس کی بستی آب و ہوا میں

پنپ رہی ہے
اُن کالے پیڑوں کی مایا
جن کی جڑوں میں
خون پڑا ہے اُس فردا کا
جس کی خاطر
شہرِ جنوں کا بانکا اپنی جان پہ کھیلا

ایک نظم فردا کے لیے

تُو کہاں سمجھے گا میرا درد پگلے
تُو کہ اُن پیڑوں کے سائے میں ابھی تک جی رہا ہے
جن کا رشتہ ہے ترے پُرکھوں کے لمسِ جاودان سے
اور میں ماں باپ سے بچھڑے ہوئے بچّے کی صُورت
اُن گھنے پیڑوں کی جانب
اشک آلودہ نظر سے تک رہا ہوں
جو مجھے پُرکھوں سے ورثہ میں ملے تھے
جن کے ہر پتّے نے دیکھی تھی مِری چڑھتی جوانی
جن کے نیچے بیٹھ کر لکھی تھی میں نے
پیار کی پہلی کہانی

ــــــ جن کے پتّوں میں چہکتی زندگی نے
میری مٹّی میں ہزاروں بیج بوئے
اور جب وہ فصل کی صورت میں پھُوٹے
تو اُنہیں کھانے کو دَوڑی
ایک ناہنجار آندھی
کیا سُناؤں داستاں
تجھ کو میں اُس بیدادگر کی
جس کے ہاتھوں
میرا وہ پندار لُوٹا
جو مجھے دیرینہ رشتوں نے دیا تھا . . . .
ہو مُبارک تجھ کو
اِن پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں پیارے
بات لیکن یہ بھی دل پر نقش کر لے
دیر کچھ لگتی نہیں ہے
آندھیوں کا رُخ بدلتے
آ کہ وہ تاریک دن آنے سے پہلے
آندھیوں کے دیوتاؤں پر
قیامت بن کے ٹوٹیں !

پنچ تاروں سے دُم دار ستارے تک

سالِ نو کو
خیر مقدم کہہ رہے تھے
پنچ تارے
یعنی نیچی بستیوں کی چھاتیوں پر مونگ دلتے عرش پارے
اور سگریٹ کا دُھواں اوڑھے ہوئے ننگے بدن کو
منزلِ ہستی سمجھ کر
قلقلِ مینا کے ایما پر تھے رقصاں، جیسے بندر
پنچ تاروں کے سکندر
اور سالِ نو کا دامن تھام کر یہ کہہ رہے تھے
اے مسرّت کے پیمبر
مہرباں ہو کر بٹھالے ہم کو اپنے دل کے اندر
ختم کر دے اپنی فیاضی ہمیں پر
بس ہمیں حق دار ہیں تیرے کرم کے اس زمیں پر

گڑگڑاتا دیکھ کر ان غاصبوں کو

سالِ نَو پہلو بدل کر مسکرایا
اور پُر اسرار مُٹھّی کو گھُما کر
جانے اُس نے کون سا جادو خلاؤں میں اُچھالا
چھا گیا ہر سُو اندھیرا
پھر ہوا ظاہر فلک پر وہ ستارہ
جس کی دُم پر موت کا کالا نشاں لہرا رہا تھا
مچ گئی بھگدڑ سی سالِ نَو کے استقبالیوں میں
اور لہرائے ہوا کے دوش پر یہ لفظ گھبراہٹ پہن کر
ہم اکیلے ہی نہیں، حق دار تیری بخششوں کے
ان کی حصّہ دار ہیں وہ بستیاں بھی
جن کو نیچی بستیاں کہتی ہے دنیا!

آوارہ کُتّا

اُس نیچی نگری والوں کو
اک مُدّت سے جس کا ڈر تھا
وہ دن آخر آ ہی پہنچا ـــــ
وحشی آدم خور کی صورت
بُلڈوزر
چنگھاڑ رہا تھا
اُس کے بھیانک خُونی پنجے
بڑھ کے
مکانوں کے سینوں میں
گھُنپتے گڑتے سے لگتے تھے

— اور اُن کے بے بس باشندے
تھر تھر تھر تھر کانپ رہے تھے
بھاگ رہے تھے ہانپ رہے تھے
اور پھر اک دم دھرتی کانپی - امبر لرزا
جیسے کوئی پرلے کا سوچک بھونچال آیا
بربادی کے کال دیو نے اس سے نکل کر
آبادی کو مار گرایا - سب کچھ ڈھایا
ملبے کے انبار سے اُٹھے دُھول کے بادل

چاروں جانب
ویرانی ہی ویرانی تھی - ویرانی سی ویرانی تھی
دردِ مجسّم تھا وہ منظر
اشک بداماں حیرانی تھی
آہوں چیخوں کے دریا میں طغیانی تھی
ایسے عالم میں بھی رواں تھی جیون دھارا
کُتّا، جس کو کہا کرتے تھے سب آوارہ
ملبے کے ٹیلے پہ کھڑا تھا
غم سے اور غصّے سے بھرا تھا - بھونک رہا تھا
ایسا لگتا تھا وہ پیارہ دیوانہ
اک طوفانی بجلی بن کر
بلڈوزر پر ٹوٹ پڑے گا
ٹوٹ پڑے گا.....

ایک سوال

وہ دھرتی جس پہ میری زندگی نے آنکھ کھولی تھی
میں اُس پر اب کوئی تخمِ تمنا بو نہیں سکتا
کبھی اُس کا تھا لیکن آج اُس کا ہو نہیں سکتا
جہاں میری خرد نے، آگہی نے آنکھ کھولی تھی

وہ گلیاں جن سے وابستہ ہیں یادیں میرے بچپن کی
مرے بھولے قدم اب اُن کے ذرّوں کو ترستے ہیں
نہ جانے آج اُن میں کیسے کیسے لوگ بستے ہیں
جہاں آباد میرے اپنوں کی، پیاروں کی دنیا تھی

وہ گھر، تہذیب نے جس میں دکھایا آئینا مجھ کو
نہ جانے اب وہ کس مجبور و محزوں کا بسیرا ہے
وہاں کیا رنگ ہے شب کا وہاں کیسا سویرا ہے
جلائے جا رہا ہے یہ بھبھوکا درد کا مجھ کو

گریں گی آہ کب تقسیم و نفرت کی یہ دیواریں
کب انساں ایک ہوگا کب مٹیں گی غم کی بھرماریں؟

جمشید پور

کہاں سوئے ہوئے ہو وقت کے دانشورو! جاگو
پکارا ہے تمہیں صحنِ چمن کے زخم زاروں نے
سسکتے، آہ بھرتے، بین کرتے گل عذاروں نے
ادیبو، شاعرو، نغمہ گرو، پیغمبرو، جاگو

تمہیں نازاں تھے اس دھرتی کے حُسنِ دردمندی پر
تمہیں کہتے رہے سانپوں کو بھی عکسِ مسیحائی
سُنو! کیا کہہ رہی ہے آج چُپکے چُپکے پُروائی
نہ برسے تم کبھی ماحول کی وحشت پسندی پر

نہ جاگے تم تو دلداری کا جادو ٹوٹ جائے گا
محبت کا خدا بھٹکے گا نفرت خیز صحرا میں
مسرت کا سفینہ غرق ہوگا، غم کے دریا میں
نہ جاگے تم تو حُسنِ زندگی پر حرف آئے گا

سیاست چھوڑ کر انصاف کی آواز بن جاؤ
اور اس وحشی فضا کو آہنی زنجیر پہناؤ

جھانکی

رات مرے دروازے ہاتھی جھول رہا تھا
اور مرے آنگن کی دھرتی
بل کھاتا لہراتا جادو پھونک رہی تھی
دُور گگن میں
ناچ رہے تھے چاند ستارے
اور مری خوشیوں کے دشمن
راہو۔ کیتو
مُنہ لٹکائے
اس جھانکی کو دیکھ رہے تھے . . . .

اور وہ بدّو
اپنے خیمے کے اندر چنگھاڑ رہا تھا
جس کے سر کو
میرے در کے ہاتھی نے پامال کیا تھا !

دسہرے کا راون

ترِی اَنا پر
جمی ہوئی گرد جھاڑ کر وہ کہاں گئے ہیں
جو تجھ کو فن کار کہہ رہے تھے
جو کہہ رہے تھے
کہ تیری مٹّی کو گوندھتے وقت چشمِ خالق چمک اُٹھی تھی
کہ تک رہی تھی
وہ نقشِ فردا
جو تیرے موئے قلم کی جنبش کا منتظر تھا....
پھر آسمانی حکایتوں نے
زمیں بداماں حقیقتوں کا لباس پہنا
اُتر گیا تیری سربلندی کا سُرخ چہرہ
اور اُن پروں کو
ہزاروں آنکھوں نے جلتے دیکھا
جو آسمانی حکایتوں نے دیئے تھے تجھ کو
جو زندگی کی حقیقتوں نے جلا دیئے تھے!

خارپشت

اِس امن کیش، محبت پرست بستی میں
یہ سُرخ شعلے، یہ خنجر کہاں سے آئے ہیں
یہ خارپشت، یہ اجگر کہاں سے آئے ہیں
جنم جنم کی شرافت پرست بستی میں

ہے کس کے ہاتھ کا جادو یہ جشنِ خوں ریزی
یہ آگ کس کی محبّت کا شاخسانہ ہے
یہ زہر کس کی شرافت کا شاخسانہ ہے
ہے کس کی ذات کا زیور نشانِ چنگیزی

لہو کے دیپ جلاتا ہے کون شام ڈھلے
اور اپنے گھر میں ستاروں کو دفن کرتا ہے
حیات بخش بہاروں کو دفن کرتا ہے
خراج لیتا ہے زخموں سے کون رات گئے

جواب مانگتے ہیں لوگ ان سوالوں کا
ہے کوئی مدّعی ان قتل ہونے والوں کا

سیما پوری

یہ بندوقیں
یہ سنگینیں
مرا مُنہ کیوں چڑاتی ہیں
مجھے وحشت سی کیوں ہونے لگی ہے اپنی وردی سے
بھیانک خواب
کیوں دشمن ہوئے ہیں میری نیندوں کے
نہ جانے ہوگیا ہے کیا مرے خوابوں کی رانی کو
نہ جانے کیا قیامت اُس پری چہرہ پہ ٹوٹی ہے
سبب کوئی تو ہوگا اُس کی اس لمبی خموشی کا

. . . .

سپاہی بڑبڑاتے بڑبڑاتے رُک گیا یک دم
اور اُس کے مُنہ سے "ستم" کا لفظ اس انداز سے نکلا
تڑپ اُٹھی ہو جیسے بجلیوں کی فوج سیما پر
پھر اپنے دوش سے لٹکی ہوئی بندوق کو لے کر
وہ اُس ٹیلے پہ ٹوٹا
جس کی خاموشی سے پھوٹی تھی
عجب سی سرسراہٹ ــــــ

جو کسی دشمن کے قدموں کی شریکِ کار لگتی تھی
مگر شبخون کا یہ شائبہ
وہم و گماں نکلا

تجھے کس مُنہ سے خط لکھوں
کہ میرا دودھیا چہرہ
فضائے جبر کی سمناک تاریکی کا حامل ہے
مِری آنکھیں
مقیّد ہیں ابھی دہشت کے جنگل میں
ابھی دھڑکن مرے دل کی
ٹھکانے پر نہیں آئی
مِری چھاتی ہے شاہد آج بھی اُس رقصِ وحشت کی
ہوا ہے جو ہماری نیک دل بستی کی گلیوں میں

. . . .

تجھے خط کس طرح لکھوں کہ میری اُنگلیاں اب تک
اُسی وحشی کے مُنہ کو نوچتی پھرتی ہیں خوابوں میں
اُڑا کر لے گیا ہے جو تقدّس میرے جیون کا

. . . .

اگر لکھتی بھی ہوں جی مار کر تو مجھ کو یہ ڈر ہے
کہیں بندوق تیری تیرے ہاتھوں سے نہ گر جائے
کہیں تیری جوانی پر مرے کارن نہ آنچ آئے !!!

ٹیلے کی موت

اس ٹیلے پر
چڑھتے چڑھتے
میری ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں
اور یہاں ہنگامۂ ہستی سرد پڑا ہے
غائب ہے وہ آنکھ جو میری آبلہ پائی کی منزل تھی
وہ آواز بھی خاموشی کی برف کے نیچے گنگ پڑی ہے
جس کی خاطر
میرا حسنِ سماعت برسوں آگ پہ لوٹا!
کاش یہ منظر
یہ فردوسِ تمنّا کا نادیدہ دوزخ!
میرے آگے سے ہٹ جائے
اور میں پھر سے
شوقِ سفر کی
پہلی منزل کی رو پہلی چاندنی اوڑھوں، نغمے گاؤں
ٹیڑھے میڑھے رستوں کی سنگین فضا کے ناز اٹھاؤں

جُنون

پھر غلط کاروں کا جادو چھا گیا
پھر مرے دل میں ہزاروں وسوسے
سانپ بن بن کر مجھے ڈسنے لگے
پھر مرا حُسنِ یقیں گہنا گیا

پھر ہوس کاروں کے وحشی قہقہے
چھین کر مجھ سے سکونِ جاں فزا
توڑ کر میرے جُنوں کا حوصلہ
کر گئے دشوار میرے راستے

اک تلاطم پھر ہوا دل میں بپا
جانے کتنے وار ظلمت نے کیے
اور کتنے دیپ جل جل کر بجھے،
دل مرا لیکن مرے پہلو میں تھا

دیکھ کر میرے جُنوں کی دسترس
آگ بن کر بجھ گیا شہرِ ہوس

لبڑی کاکا

مندر کی دیوار پہ بیٹھا
لبڑی کاکا
دل ہی دل میں سوچ رہا تھا
ایک نہ اک دن
اس مندر کی اوٹ سے اُس کے سپنوں کا وہ چاند چڑھے گا
جو اک سُندر بالک بن کر
اُس کے سُونے آنگن کو آباد کرے گا
اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں
دائیں بائیں کھیلتے بچّوں کی آنکھوں میں
اُس رنگت کو ڈھونڈ رہی تھیں
جس کا رشتہ
اُس ان دیکھے بالک کی آنکھوں سے ہو گا

اتنے میں اک نٹ کھٹ لڑکا
جانے کس جانب سے دَوڑا دوڑا آیا
اوراس کی چوٹی کو اپنے ہاتھ میں لے کر
پیار بھرے لہجے میں چہکا
"لبڑی کاکا!
کیا تم آج نہیں ناچو گے ؟"
یہ سُنتے ہی اس کے مُنہ سے
لبڑی .... لبڑی کا دیرینہ نغمہ پھُوٹا
اور اگلے لمحے نے اس کو
بچّوں کے حلقے میں ٹوٹ کے ناچتا دیکھا
اور وہ بالک
جو سپنوں کا چولا پہنے
اُس کے آنگن میں اُترا تھا
پھر اُس کو دیوانہ کہہ کر
دُور کہیں تاروں کے جھرمٹ میں جا بیٹھا ...

آئینے

ٹوٹ گیا دستک کا جادو
لیکن بوڑھے دروازے کی
گہری میٹھی نیند نہ ٹوٹی

اُس کے گندے ذہن میں اُبھریں
گندی گندی سی تصویریں ! !
اور اُن قاتل تصویروں نے
خون کیا اُس پاکیزہ کا
جس کو وہ بیوی کہتا تھا

لیکن اُس کے ذہن میں وہ تصویر نہ اُبھری
جو اُس دروازے کا رستہ روک رہی تھی
اِک دُبلی پتلی سی عورت
ہاتھوں سے ننگاپن ڈھانپے
دروازے سے ٹیک لگائے
سر لٹکائے کانپ رہی تھی
اور اُس کی وہ میلی ساڑھی
جو برسوں سے اُس کے تن کی
واحد ہاں واحد زینت تھی
اک پتلے سے تار سے لپٹی
دُھوپ کی کرنیں لُوٹ رہی تھی
سُوکھ چلی تھی ....

جزیرہ

میں جانتا ہوں
کہ تم ہو اُس کامراں جزیرے کی سخت مٹّی
جو آنسوؤں سے بھرے سمندر کی گود میں مسکرا رہا ہے
جو اپنے سینے پہ پنج تارے سجا سجا کر
فلک کو آنکھیں دکھا رہا ہے
مگر نہیں ہے خبر یہ جس کو
کہ موت ساماں
مُہیب طوفاں
اُٹھے ہیں اکثر سمندروں سے
اور اَن گنت
کامراں جزیروں کو گود میں لے کے سو گئے ہیں
اور اُن جزیروں کا نام لیوا کوئی نہیں ہے بھرے جہاں میں

دُھواں

تمہیں بتاؤ
کہ جُرم کیا تھا
اُس آشنائے جہانِ غم کا
جو شہرِ محنت کو دے کے اپنے لہو کا تحفہ
ہزار مجبوریوں کو مسکان میں چھپاتا
قدم قدم پر
محبّتوں کے دیے جلاتا
اُس آشیانے میں سر چھپانے کو جا رہا تھا
جو مفلسی کا نشان ہو کر بھی اس کے دل میں اُتر گیا تھا

— جہاں سے آتی ہوئی ہوا دے رہی تھی اُس کو
پیام اُن آتشیں لبوں کا
جو اس کے قدموں کی چاپ سُن کر پھڑک اُٹھے تھے
دھڑک رہے تھے
اسی ہوا کے ہر ایک جھونکے میں ان فرشتوں کے ننھے دل بھی
کہ جن کی کلکاریوں سے اس کو جہان بھر کی خوشی ملی تھی
مگر اچانک
کہیں سے آکر
ہوائے وحشت نے اس محبت بھری فضا کے گلے پہ جیسے چھُری سی رکھ دی
پھر اُس کا زخمی وجود چیخ و پکار بن کر
اُس آشیانے کی سمت لپکا
کہ جس میں آباد اس کے اپنوں کا اک جہاں تھا
مگر وہاں اب فقط دُھواں تھا!

مزار

نہ جانے کون سے صحرا کی مشتِ خاک تھی وہ
مزار مانگتی پھرتی تھی جو ہواؤں سے
یہ سوچ کر کہ کسی دن وہ برگِ آوارہ!
انھیں ہواؤں کے کندھے پہ چڑھ کے آئے گا
اور اُس کی دُھول کو ماتھے پہ مل کے چیخے گا
اُٹھو کہ تازگی نے پھر تمہیں پکارا ہے
اُٹھو کہ روشنی نے پھر تمہیں پکارا ہے
اُٹھو کہ زندگی نے پھر تمہیں پکارا ہے

نکل کے آئے گی پھر وہ مزار سے ایسے
کہ شہرتوں کے تمدّن کی آب ہو جیسے
مگر ہواؤں کی فطرت سے تھی وہ ناواقف
نہ اس خیال نے اس کو کبھی جھنجھوڑا تھا
کہ ان کی چال پہ موسم کی حکمرانی ہے
یہ رُک بھی جاتی ہیں اُس کا اشارہ پاتے ہی
اور اپنے دوش پہ لادے ہوئے جنازے کو
اُتار دیتی ہیں تہہ میں کسی سمندر کی !
جہاں مزار بنے بھی تو کون دیکھے گا !
جہاں مزار بنے بھی تو کون آئے گا !
پیام زندگی شہرت کی ڈالیاں لے کر
کہ اہلِ شوق بھی اب مصلحت کے قائل ہیں

انٹرویو

آئیے میں منتظر تھا آپ ہی کا
کچھ نہ کہئے اپنے بارے میں کہ ہر سُو ہو رہا ہے
آپ ہی کے ظاہر و باطن کا چرچا
کم نہیں ہوتا امیرِ شہر سے ہتنگے کا رشتہ
میں کہ اک ادنیٰ سا خادم ہوں اُسی کا
کس طرح کہہ دوں کہ اس دفتر کی وہ خالی اسامی
اشتہاروں میں برابر ہو رہا ہے ذکر جس کا
آپ کے قد سے بڑی ہے

وقت کا ایسا یہی ہے
اپنے فرضِ منصبی کو بھول کر میں یہ اسامی
یہ متاعِ شادکامی
آپ کے قدموں میں رکھ دوں
اور اُس چھوٹی سی دنیا کو بچا لوں
جو مری مجبوریوں کی راز داں ہے
لیکن اِن آنکھوں کو کس اندھے کنوئیں میں جا کے پھینکوں
جن کے آگے
نِت نئے بولوں کے ہاتھوں
شہر کے قد آوروں کا خونِ ناحق ہو رہا ہے
کیا امیرِ شہر سے لہتگے کا رشتہ
آج سب کچھ بن گیا ہے؟
کچھ تو کہئے آپ کیوں چُپ سادھ کر بیٹھے ہوئے ہیں!

سوگندھی

اِک بے چہرہ
سیٹھ کے مُنہ سے
نکلے ہوئے
اِک لفظ نے ڈھائی :
سَوگندھی کے دل پہ قیامت
اور وہ غیرتِ کوئے ملامت
چیخ سی اُٹھی
اور تغافل کی دیواروں سے سر پھوڑ کے واپس لَوٹی ۔

مادھو ــــــ
جو خواب دکھاکر
جانے کب سے ــــــ

لُوٹ رہا تھا:
اس مجبور کے تن کی رونق
من کی خوشبو ـــــ
اور خراج بھی لیتا تھا جو
زخمستان کی اس دیوی سے . . . .

تیری ضرورت
میری ضرورت سے افضل ہے
جو کچھ میرے پاس ہے، لے جا
اور اپنے دُکھ مجھ کو دے جا
دُور کہیں پھر
سیٹھ کے مُنہ سے
نکلا ہوا وہ لفظی تیر ہوا میں چمکا
کھولی میں بجلی سی کڑکی
سوگندھی مادھو پر برسی:
کون ہو تم ...
پھر کھولی میں سجی ہوئی تصویریں ایک اِک کر کے ٹُوٹیں
مادھو کی تصویر بھی ٹُوٹی ـــــ
بھاگ یہاں سے ورنہ...
سوگندھی کی بلند آواز فضا میں گونجی

—— اور اس کا خارش زدہ کُتّا
جو سُوکھے ہوئے چیلوں پر سر رکھ کے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔
مادھو کی جانب مُنہ کر کے
زور سے بھونکا ۔ ——
پھر بُوڑھے برگد کی داڑھی کی صورت وہ موذی کانپا،
گِری ہوئی ٹوپی کو اُٹھانے کے لئے لپکا ——
... رہنے دے یہ تاج یہیں ...
سوگندھی چیخی ——

اندر کے موسم کے بدلتے ہی باہر کا موسم بدلا
سوگندھی نے
اپنے دیرینہ ساتھی کو
پیار بھری نظروں سے دیکھا
اور بہت یاد آیا اس کو
پانڈو پُتر یدھشٹر کا لافانی کُتّا

دُور کہیں
سچائی کے سُورج نے اپنی آنکھیں کھولیں
ٹوٹ گیا پاکھنڈ کا جادو
گنگ ہوئے مادھو کے تقاضے
جم گئے سیٹھ کی کار کے پہیّے ...

برگد بابا

کھیل رہے تھے
برگد بابا کی داڑھی سے
شہرِ ادب کے نٹ کھٹ بچّے
اُن کے چہرے
حُسنِ شرارت کے پَرتَو سے دمک اُٹھے تھے
اور وہ خوش تھے!
لیکن کیا معلوم تھا اُن کو
برگد بابا
چُپکے چُپکے
اُن کے کچّے ہاتھوں پر کچھ ایسی لکیریں کھینچ رہا تھا
جو اُس وقت نمایاں ہوں گی
جب اُن کی سوچوں کی داڑھی
بڑھتے بڑھتے
برگد بابا تک پہنچے گی!

کالا گھوڑا

یہ گھوڑا
یہ کالا گھوڑا
گھوڑوں کا سردار سہی
اس کی پیٹھ پہ گوری بستی کی رفتار کا بار سہی
اس کے سُموں سے نکلتا بادل عرش کا پہرے دار سہی
لیکن میں کیوں اِس کے سُموں پر اس بستی کا نام لکھوں
جس کے باسی
جوشِ جنوں میں
دیواریں دوڑاتے ہیں
عرش سے ہو آتے ہیں، لیکن
فرش نشیں کہلاتے ہیں!

چار کندھوں کی جستجو میں

فلک پہ تاروں کی روشنی تھی
زمین وعدوں کی چاندنی میں نہا کے جنّت بنی ہوئی تھی
سمے کا جادو عروج پر تھا
نظر نظر میں
بسا ہوا تھا برابری کا حسین چہرہ
نفس نفس سے رواں تھا دریا محبّتوں کا

پرانے مجرم
نئی کچہری میں ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے تھے

مگر وہ فتنے
جو اُن کی کہنہ روایتوں سے جُڑے ہوئے تھے
جو اُن کی نس نس میں بس گئے تھے
برابر آواز دے رہے تھے
کہ تم حریفِ برابری ہو
بدل کے رکھ دو سمے کے رُخ کو
اِدھر یہ مشکل بنی ہوئی تھی
اُدھر اندھیری زمین پر بے کفن پڑی تھی
اور آدمیّت کے چار کندھوں کی جستجو میں
مذاقِ دَوراں اُڑا رہی تھی
وہ لاش ـــ جس کا قصور یہ تھا
کہ اُس کی مٹّی نے اپنی بستی کی اُس گلی میں جنم لیا تھا
کہ جس کے ہر موڑ پر برابر لکھا ہوا تھا
مجھے نہ چھُونا .....

بابِ درد

صفِ ماتم پہ طاری تھی خموشی
مِرے پہلو میں بیٹھا ایک بُوڑھا
زبانِ خامشی میں کہہ رہا تھا
وہ ناگفتہ کہانی، جس کی تہہ میں
تھا پوشیدہ کوئی ناسُور اُس کا

مِرے حُسنِ قیافہ نے اُجالے
کئی گوشے اس اندھی داستاں کے
یہ مالی طور پر لُوٹا ہوا ہے
کنواری بیٹیاں بیٹھی ہیں گھر میں
جواں بیٹوں کی تعلیمی مہارت
پڑی ہے وقت کے اندھے کنوئیں میں

اِسی بستی کا کوئی ناگ شاید
اِسے، یا اس کے گھر کو ڈس گیا ہے
یہی رونا، یہ رونا چاہتا ہے
مگر نادم ہوا حُسنِ قیافہ
جب اُس بُوڑھے نے بابِ درد کھولا
تھا خوش قسمت بہت ہی مرنے والا
جواں بیٹوں کے کندھوں پر گیا ہے
مگر بیتے گی میری لاش پر کیا
مِرا تو ایک بھی بیٹا نہیں ہے
اور اس پر دُور ہے مرگھٹ یہاں سے . . . . .

آبلہ دست

رات مری سوچوں کے دھارے
میری ذلّت کی گہرائی ناپ رہے تھے
اور وہ چکّی
جس نے مجھ کو ذلّت کا وردان دیا تھا
جس کو پیستے پیستے میرا عہدِ جوانی بیت گیا تھا
جس نے میری آشاؤں کا خون پیا تھا
میرے ہاتھوں کے چھالوں کو چُوم رہی تھی
دھیرے دھیرے گھُوم رہی تھی ....
دُور کہیں وہ توندل کتّے
جو میری محنت کا حاصل چاٹ گئے تھے
سرشاری کی سیج پہ بیٹھے
اُونگھ رہے تھے ....
اور وہ آنکھیں
جن پر شہرِ محنت کی نگرانی کا الزام آتا تھا
اپنا ڈگی پیٹ رہی تھیں!

لچھمن ریکھا

لاؤڈ اسپیکر چیخ رہا ہے

دُہراؤ

دُہراتے جاؤ

میں مجرم ہوں

میں مجرم ہوں .....

میں نے کیا اپرادھ کیا ہے

اک دیرینہ یاد کے صدقے

اُس بستی کا نام لیا ہے

— جس کی گلیوں میں کھیلا تھا میرا بچپن
آنکھ کھُلی تھی
جس کی نرم فضا میں میرے ارمانوں کی
جس کے کھیتوں کھلیانوں میں
میری پہلی پہلی محنت کے سپنے ساکار ہوئے تھے
.... تم نے اپنے دَور کی لچھمن ریکھا کا اپمان کیا ہے
من مندر میں بسی ہوئی اُس پنچوٹی کا نام لیا ہے
جو اب لنکا کا حصّہ ہے .....
تم مجرم ہو
دُہراؤ
دُہراتے جاؤ
میں مجرم ہوں
میں مجرم ہوں
میں مجرم ہوں ....

چیر ہرن

صدیوں پہلے
اس دھرتی پر
دروپدی کا ایمان ہوا تھا
اور تو سب کچھ بھول کے اُس کا چیر بڑھانے آپہنچا تھا
لیکن آج ترے گیتوں کا چاند برابر ڈوب رہا ہے
گلی گلی دریودھن کا دربار سجا ہے
اور دُشاسن
بھری سبھا میں
ابلاؤں کے
کورے وستر اُتار کے تیری غیرت کو للکار رہا ہے

——— اور اُن کی دکھیاری مائیں
تیری دُہائی دیتے دیتے ہار گئی ہیں
بےبس ہو کر اپنی چھاتی پیٹ رہی ہیں
جمنا کی لہریں بھی یہ انیائے دیکھ کے جل اُٹھی ہیں
اور ترے قدموں کی آہٹ مانگ رہی ہیں . . . . .
لیکن تو اُس پار کہیں مدہوش پڑا ہے
اور یہ وچن بھی بھول گیا ہے
"جب جب اس دھرتی پہ گلانی دھرم کی ہوگی
میں آؤں گا"

تیری آگیہ ہو تو میں یہ پرشن اُٹھاؤں ؟
دروپدی تیری کیا لگتی تھی
اور ان ابلاؤں نے کیا اپرادھ کیا ہے ؟

ہری چوڑیاں

جنسِ بازار تھیں
کل سبھی یہ چوڑیاں
یہ ہری چوڑیاں
لیکن ان کا خریدار کوئی نہ تھا
آج وہموں کے موسم کی وہمی ہوا
کر گئی ہے انھیں ایسی قوّت عطا
کھینچ لائی ہے جو شہر کی عورتوں کو ہر اک سمت سے
اور ان کے لئے
سُونی باہیں ہیں آپس میں اُلجھی ہوئی . . . .

خیر ہو چوڑی والوں کے غم خوار کی
جس نے وہموں کے موسم کو آواز دی!

کنگن اور کلائی

تیرا دُکھ
صدیوں کا دُکھ ہے
میری بیٹی !
کون سے یُگ میں تیری دُکھیا ماں نہیں روئی
کون سے یُگ نے تیرے چہرے پر اپنی کالک نہیں لپوتی
کون سے رستے سے تیرے ارمانوں کی ارتھی نہیں گزری
کس حیران کنوئیں کے تارے نے تیری صورت نہیں دیکھی

تیری چیخیں سُن کر دھرتی کا سینہ تو چاک ہوا ہے
پیڑوں نے چھاتی پیٹی ہے
بادل کی آنکھیں برسی ہیں
اور ہوا میں اُڑتے پنچھی
اپنا رستہ بھول گئے ہیں

لیکن وہ پتھر کی آنکھیں!
جن کی خاطر
تُو نے صدیوں دُکھ جھیلے ہیں
کب پگھلی ہیں؟
کب اپنی سنگینی سے بیگانہ ہو کر
نرمی کی تنویر بنی ہیں
لیکن ان آنکھوں کا بھی کیا دوش ہے بیٹی
ان پر بندھی ہوئی ہے اُس موسم کی پٹی
دیتا ہے ترجیح جو تیری گول کلائی پر کنگن کو
جو تسکینِ نفس کی خاطر ڈس لیتا ہے تیرے من کو

اَدھورا منظر

نگاہِ نشتر میں بس گئے تھے
وہ سنگ ریزے
جو میری بچّی کا خون پی کر
پنپ رہے تھے
تھا جن کو آنا وہ آ چکے تھے .....
یہ دودھ گنگا کی چشمِ تر تھی
یہ تھے وہ بازو
کہ جن کی پہچان تھی محبت نشان راکھی
یہ رشتۂ خوں کے ترجماں تھے
یہ ملنے والے تھے، مہرباں تھے
مری عزیزی نے سب کے چہروں کو طائرانہ نظر سے دیکھا
پھر اُس کی بیمار آنکھ سے اک ستارہ ٹوٹا
جو کہہ گیا بے زبانیوں کی زبان بن کر
کہاں گیا ہے وہ میرا اپنا
کہ جس نے دنیا کے سامنے مجھ سے یہ کہا تھا
میں تیرے دُکھ سُکھ میں ساتھ دُوں گا!

کل کی سوچو

میرے گھر آنگن کے فردا کی ضمانت
یہ محبت کی فضا میں جھومتے سرسبز لوپودے
جن کو سینچا ہے ہمیشہ میں نے اپنے خونِ دل سے
آج اپنی شوق پرور ٹہنیوں کو
اُن پرندوں کی طرف پھیلا رہے ہیں
جو نہیں واقف رموزِ زندگی سے
دیکھ کر دل بستگی ان من چلوں کی
میرے تن من میں سیاہی کھول اُٹھی ہے
اور مٹھی بندھ گئی ہے .....

——— پھر مِرے دل کے کسی گوشے نے یہ آواز دی ہے
کیا دیا ہے تُونے ان اپنوں کو نا داں
ان کا مستقبل نہیں کیا ایٹمی دوزخ میں سوزاں
مَوت کا سامان دے کر
ان سے ظرفِ زندگی کیوں مانگتا ہے
یا تو ان کو اعتمادِ زندگی دے
یا اُٹھا کر طاق پر رکھ دے وہ ڈائیٹس
جو ترے ہونٹوں پہ برہم ہو رہی ہیں

....

میری مُٹّھی کُھل گئی ہے
اور آنکھوں میں نمی ہے!

انتقال

رات کے بارہ بجنے کو ہیں
کچّی پکّی نیند سے بوجھل
بُوڑھی آنکھیں

اپنے اندر
بچّے کی پہلی مسکان کا عکس چُھپائے
چاند کی صورت چمک اُٹھی ہیں
خُشک لبوں سے
پھُوٹ پڑی ہے
پیار کی گنگا

کون آیا ہے؟
میں ہوں ماں جی
اتنی دیر سے کیوں آئے ہو
شرم نہیں آتی ہے تم کو
دیر کہاں کی؟
ابھی تو نو ہی بجے ہیں ماں جی
موڑ کے پیچھے گھڑی کی سوئیاں
کب تک بہکائے گا پگلے

آج وہ رشتہ ٹوٹ گیا ہے
جس کے بل پر
نصف صدی کا ہو کر بھی میں
کھیل رہا تھا
بچپن ہی کے گھر آنگن میں

ہری دوار

شام کے سرمگیں دُھندلکے میں
ایک دل دوز چیخ لہرائی
دم بخود ہو گئے طیور و درخت
پتّی پتّی کی آنکھ بھر آئی

لیکن اس درد خیز منظر کا
قلبِ قاتل پہ کچھ اثر نہ ہوا
اُس کی تہذیب کا نشاں خنجر
ایک ہم جنس کے کلیجے میں
خون پینے کو بار بار اُترا
دیکھ کر سُرخ رُوئی خنجر کی

—— پیاس قاتل کی اور تیز ہوئی
پھر وہ تہذیب یافتہ وحشی
جس کو خوں ریزیوں سے اُلفت تھی
جس کو وحشت تھی آدمیّت سے
جس کے ماضی پہ خوں کے چھینٹے تھے
خون آلودہ حال تھا جس کا
جس کے فردا کا رنگ مہمل تھا
پھاڑ کر جامہ آدمیّت کا
کھُل کے وحشت کی داد دینے لگا
پھر شقاوت کا ننگا ناچ ہوا
پھر وہ دل دوز چیخ ڈُوب گئی
درد کے بے کراں سمندر میں
لاش گنگا کو سونپ کر قاتل
جا چھُپا ایک سُونے مندر میں
پھر ہری اوم کی صدا گُونجی
وقت کے خونچکاں اندھیرے میں
سو گیا لمبی تان کر قاتل
اپنے بھگوان کے بسیرے میں

دُور اُس ماں کی آس ٹُوٹ گئی
جس کا بیٹا ابھی نہ لوٹا تھا

برگد

جانے کب سے بیٹھا ہے اِس موڑ پہ یہ نابینا بالک
جانے کب سے اس بستی کے دل میں بیٹھا ہوا مسیحا
اس مجبور کو بھکشا دے کر اپنی مُکتی ڈھونڈ رہا ہے

جانے کب سے چیخ رہی ہے
اُس دُکھیاری ماں کی ممتا
جس کے گھر آنگن کا اک مسکاتا پودا
اپنی نادانی کے صدقے
بے مہری کے دوزخ کا ایندھن بن بیٹھا

اور کسی تاریک گلی میں
اندھی آنکھوں، ٹوٹی ٹانگوں، کوڑھے جسموں کی مانوس فضا میں بیٹھا
بستی کے بھک منگوں کا نادیدہ راجا
جانے کب سے ڈھونڈ رہا ہے
مانوتا کے نام پہ وہ ناپید پرندہ
جس کی ایک جھلک دکھلاتے ہی انسان کی آنکھیں پھوٹیں
ٹانگیں ٹوٹیں
سندرتا کوڑھی ہو جائے
اور کوئی آواز نہ آئے.....
اور اس برگد کی داڑھی ریشم ہو جائے
جس کے ہر پتے پہ اُس کا نام لکھا ہے!

غزل — سیہ خانے سے سیہ خانے تک

غزل

زینہ چڑھی

اور اجتماعِ بادہ خوراں میں

صدائے عیش دے کر

صحنِ زنداں میں اُتر آئی

جہاں زنجیر میں جکڑے ہوئے انساں کے حُسنِ کج کُلاہی نے

اُسے انسانیت کے نام پر محشر بپا کرنے کی جرأت دی

مگر وہ نائیکہ!

وہ کج ادا بھی اپنے فن کی آبرو نکلی

جو اس شیریں دہن کی شہد افشانی پہ زندہ تھی

نہ جانے کب وہ اپنے زینۂ کردار سے اُتری

اور اس کرموں جلی کو ساتھ لے کر پیچ تالے کے سیہ خانے میں جا بیٹھی!

تاجور

اُٹھ گیا بزمِ سخن سے
وہ بگولا
جو بنامِ زندگی مشقِ فنا کرتا رہا تھا
اور کسی بھی آنکھ سے ٹوٹا نہیں کوئی ستارہ ....
اُس نے کب اس شہر کی رسموں میں اپنا دل رکھا تھا
موسموں کا ساتھ اُس نے کب دیا تھا
یہ کہا تھا اُس نے کب وحشی ہوا سے
تو حدیثِ دردمندی کی امیں ہے
تیرے ماتھے پر کسی کا خوں نہیں ہے
وہ تو کھُل کر اُن سیہ خانوں پہ اُنگلی رکھ رہا تھا
گُم ہوا تھا جن کے تہ خانوں میں سورج زندگی کا

اُس کے نغموں کا اُجالا
کب پسند آیا تھا شہرِ دل کے اُن جادوگروں کو
جن کے ایما پر اندھیرے پل رہے تھے
اور اُنہیں فتنہ گروں کی تیرہ سامانی میں ڈوبا
وہ ستاروں کی حکایت کہنے والا
وہ عظیم انسان .... وہ دُکھ کا ہمالا
کون تھا اُس کا یہاں جو اُس کو روتا
ماسوا اُس بھیڑیے کے
جو برابر اُس کے دروازے پہ بیٹھا
اشک آلودہ نگاہوں سے وہ تختی پڑھ رہا تھا
جس پہ لفظِ تاجور لکھا ہوا تھا!

پُوجا

کل سڑکوں کا جال بچھانا کام تھا میرا
کل موٹر کے پہیّوں کی رفتار بڑھانا کام تھا میرا
کل ساگر کی چنچل لہروں سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے جہازوں کو اُس پار لگانا کام تھا میرا
اور میں اپنے آپ کو بھول کے اِس پُوجا میں جُٹا ہُوا تھا
لیکن میرے گگن مندر کا پرم پروہت
میری پُوجا کے پھُولوں میں
کالے موتی ڈھونڈ رہا تھا
اور جب اُس نے
اپنے ہاتھوں کو خالی کا خالی پایا
تو وہ آگ بگولا ہو کر مجھ پہ برسا
پھر جیسے بھونچال سا آیا
اور مِری پُوجا کا آسن
سڑکوں اور جہازوں کی تہذیب سے کٹ کر
اُن لوگوں کے دُکھیا آنگن میں جا پہنچا
جو سپنوں کی چاندنی اوڑھے
دُکھ کے سائے ناپ رہے تھے
جو گگن مندر دوارے دستک دیتے دیتے ہار گئے تھے!

اندھیارے کی مخلوق

رات میں اُس جنگل سے گزرا
جو بن باسی رام کی سانسوں سے مہکا تھا
میرے ذہن میں گھوم رہی تھی
صدیوں پہلے کی وہ کُٹیا
جس میں سورج ونشی نے وشرام کیا تھا
لیکن میری بدقسمت آنکھوں کے آگے
اندھیاروں کی چادر اوڑھے
اُونگھ رہا تھا
ایک نشیلہ ۔ ادبھت ٹیلہ

اُس پر بیٹھا
ایک چھبیلا
دُور خلا میں گھُور رہا تھا.....
میں نے اُس اندھیارے کی مخلوق سے پُوچھا
کون ہو تم ؟
اور کس دنیا میں کھوئے ہوئے ہو ؟
زہر بھرا ان شبدوں کا مرے کانوں میں ٹپکا
میں ہوں نئی ایودھیا کے دشرتھ کا بیٹا
اور آیا ہوں اس جنگل میں ڈھونڈنے وہ سونے کی لنکا
جس کو میرے پُرکھوں کی نادانی نے برباد کیا تھا !

اَندر کا کوڑھ

منا چکے ہو تم اس کے جانے کا جشن لیکن
گیا نہیں ہے وہ دشمنِ آبروئے ہستی
یہیں کہیں ہے
یقیں دلایا گیا تھا تم کو
کہ اس کے جاتے ہی لَوٹ آئیں گی وہ بہاریں
جو اس کے قدموں کی چاپ سُن کر
یہاں سے کافور ہو گئیں تھیں
وہ شہد ندیاں
جو اس کے طرزِ عمل کے جاڑے نے کیل دی تھیں
پگھل پگھل کر
کریں گی سیراب وادئ دل کا چپہ چپہ
جنازہ اُٹھے گا وحشتوں کا کدورتوں کا
نہ پھر بزورِ سناں کوئی سرفراز ہوگا
نہ ہوگا محرومیوں کی دلدل میں کوئی رُسوا

ہر ایک جانب سے آئے گی پھر صدائے ہستی، بہ رنگِ مستی
فلک سے آنکھیں ملائے گی پھر تمہاری بستی
مگر کہاں اس یقیں کی رفعت
کہاں یہ وہم و گماں کی پستی
کہاں بہاروں کے لَوٹ آنے کا وہ فسانہ
کہاں خزاں کا یہ تازیانہ
کہاں وہ شہدِ رواں کی باتیں
کہاں یہ وحشت کہاں یہ گھاتیں
تمہی بتاؤ
کدھر گئی ہیں
فرازِ ہستی کی سمت بڑھتی ہوئی براتیں
ذرا شکستِ یقیں کی تہہ میں اُتر کے دیکھو
تمہاری آنکھوں کو دعوتِ جشنِ یاس دے گا
تمہارے اَندر کے کوڑھ سے ساز باز کرتا ہوا وہی فتنہ سازِ عالم
کہ جس کو تم داستانِ ماضی سمجھ رہے ہو!

وہ آنکھ

ترے مؤرخ
تری حکومت کے روز و شب کو
ہزار آنکھوں سے دیکھ بیٹھے
مگر شکستِ نظر کا ماتم
پڑا ہوا ہے صفوں میں ان کی
یہ بھید اب تک کھلا نہیں ہے
کہ تیری تنویر کس ستارے کی آبرو تھی!

وہ آنکھ کیا تھی؟
کہ جس کے بَل پر
شکست دی تو نے مہر و مہ کو
کہ جس کے حلقے میں تاجِ شاہی
فقیر کا دل بنا ہوا تھا

——جو کورے کاغذ میں جذب تحریر پڑھ رہی تھی
جو آنے والے سمے کی چالوں کو دیکھتی تھی
جو اپنی آوارگی پہ پہرے بٹھا کے آزاد ہو گئی تھی
جو چشمِ دہقاں میں تیرتے آنسوؤں کا تیر تھ بنی ہوئی تھی
جو ناچتی تھی
جو کھیلتی تھی
شریر بچوں کی طرح بارش کے پانیوں میں
یہ بھید ان پر کہاں کھلے گا
کہ کرمِ خوردہ کتاب سے کیا نشاندہی ہو گی زندگی کی
مگر میں شاعر ہوں،
تیرے دل کی
ہر ایک دھڑکن کو سن رہا ہوں
میں جانتا ہوں
کہ تیری تنویر کس ستارے کی آبرو تھی
مجھے تو اتنا ہی پوچھنا ہے
کہ میرے وقتوں کی تیرگی میں
اُس آنکھ کا کب ظہور ہو گا
کہ جس کے بل پر
شکست دی تُو نے مہر و مہ کو!

خیر خواہ

نکل گیا ہے وہ اپنا نشان لہراتا
مگر یہ پُوچھے کوئی اُس کے خیر خواہوں سے
وہ زخم کیا ہے جو خنداں ہے اُن کے پہلو میں
جو اُن کی رُوح سے اُبھری ہے وہ صدا کیا ہے
کہاں سے لائے ہیں یہ آنکھ جس کے حلقے میں
وہ تیز گام ہے اور ایک خون کا دریا
لہو میں ڈوب رہی ہے وہ شاخ چندن کی
جو ناگ بنس کے راجا سے اُس نے چھینی تھی!

غزلیں

وہ چاندنی جسے تہذیبِ نفس کہتے ہیں
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ بڑا اندھیرا ہے

○

ہر گلی کے موڑ پر تیرا کہا موجود ہے
پھر بھی اس بستی میں پرکھوں کی دعا موجود ہے

یہ اندھیرے کھا گئے ہوتے متاعِ زندگی
وہ تو کہیے ہم فقیروں کی صدا موجود ہے

ہو رہی ہیں پھر کہیں بن باس کی تیاریاں
ٹوٹتے رشتوں میں راون کی انا موجود ہے

کیا ہوئیں دستِ شفا کی حاشیہ آرائیاں
زندگی مفلوج، دردِ لا دوا موجود ہے

کچھ تو مجھ کو دشتِ غم سے آنے والے پنچھیو
کیا وہاں اب تک وہی وحشی ہوا موجود ہے؟

سرخرو کیسے ہوا؟ کیونکر ہوا؟ کالا شجر!
کیا جڑوں میں اس کی کوئی دیوتا موجود ہے؟

بیٹھ کر ساحل پہ ناداں صورتِ طوفاں نہ دیکھ
ڈوبتی کشتی میں تیرا مدّعا موجود ہے

○

چہرۂ عیسیٰ لگاکر روئے ہیبت ناک پر
کون پہرہ دے رہا ہے زخم کے ادراک پر

طاق پر رکھے کھلونے ہو گئے عرش آشنا
رہ گئے شہباز لیکن پھڑ پھڑا کر خاک پر

کیا سماں باندھا ہے اُس نے دیکھتے ہی دیکھتے
خندہ زن تھی رات جس کے دیدۂ نمناک پر

ہے جنوں کی کارفرمائی کہ موسم کا فتور
اک دھماکہ تو ہوا ہے سرحدِ ادراک پر

ہر قدم اُن کا ہے ناداں سُرخ رُوئی کی طرف
اور ہر لغزش کی تہمت مجھ گریباں چاک پر

○

لہو کی دستک سے شہرِ دل کا کوئی بھی دروازہ وا نہ ہوگا
سُنائے گی جو زبانِ خنجر وہ فیصلہ دیرپا نہ ہوگا

کوئی بھی فتنہ جگا کے دیکھو کوئی بھی طوفاں اُٹھا کے دیکھو
جو میرے حق میں بُرا ہے یارو تمہارے حق میں بھلا نہ ہوگا

جہانِ اضداد کے پرندو! پروں کو تولو، زباں بھی کھولو
کہ ایسے گُھٹ گُھٹ کے بیٹھنے سے تمہارا مطلب ادا نہ ہوگا

چلو کہ اشکوں کی روشنی میں اُس آستانے کی راہ ڈھونڈیں
جہاں ہمارے معاملوں میں مخل کوئی دوسرا نہ ہوگا

ہزار برہم ہے دل کا موسم، مگر ہے رسمِ جنوں بھی قائم
قدم قدم پر ہے خس کا چرچا وہ حادثہ رُونما نہ ہوگا

یہ سوچ کر چل پڑا ہوں ناداں میں اُس دیارِ جنوں کی جانب
جو اہلِ غم نے کیا تھا روشن وہ دیپ اب تک بُجھا نہ ہوگا

○

برپا ہے جو دھرتی پہ وہ محشر نہیں دیکھا
تو نے کبھی ہاتھی سے اُتر کر نہیں دیکھا

ہم بچ کے نکل آئے ترے شہر سے ورنہ
کس موڑ پہ کس ہاتھ میں خنجر نہیں دیکھا

کیا پوچھتے ہو سختیٔ حالات کی، ہم سے
دیوار تو دیکھی ہے مگر در نہیں دیکھا

میں پیار کو ترسے ہوئے بچے کی طرح ہوں
تُو نے مجھے آغوش میں لے کر نہیں دیکھا

کیا اُٹھ گئے اس شہر سے وہ امن کے حامی
مدت سے کوئی جلتا ہوا گھر نہیں دیکھا

محفوظ جزیرے کی بقا مانگنے والو
کیا تم نے وہ اشکوں کا سمندر نہیں دیکھا

ناداں یہ نظر باندھنے والے بھی ہیں کیا خوب
کس سمت سے آیا ہے یہ پتھر نہیں دیکھا

○

جس قدر بھی زہر دل میں تھا زباں پر آگیا
اُس کے لب کھُلتے ہی گویا سانپ سا لہرا گیا

رات جو ہم نے سُنی تھی وہ تری آواز تھی
صبح لیکن اپنی خوش فہمی پہ رونا آگیا

اب یہ افسردہ دھندلکے اوڑھ کر سو جائیے
اب تو وعدوں کے جہاں کا چاند بھی گہنا گیا

جانے مایوسی کی کس منزل میں تھے اہلِ یقیں
پیر کا دھاگہ بھی ان کو روشنی دکھلا گیا

دیکھیے ٹکتی ہیں کب تک یہ پُرانی کھڑکیاں
آج سڑکوں کا تمدّن ان کا دل دہلا گیا

آؤ ناداں آج اُس ناسُور کا ماتم کریں
جو خراجِ زندگی لے کر بھی ہم کو کھا گیا

○

یہ شہرِ وعدہ فروشاں، یہ مستیاں یارو
نشاط اور ڈھ کے رقصاں ہیں تلخیاں یارو

○

بُتوں کو توڑ کے محمود سرفراز ہوا
مگر ہیں اپنی جگہ بُت پرستیاں یارو

کوئی کلنک لگاؤ کسی کے ماتھے پر
بہت اُداس ہیں تہمت طرازیاں یارو

نکل کے اپنے گھروں سے پڑ و نہ خطرے میں
گلی کے موڑ پہ بیٹھی ہیں آندھیاں یارو

کہیں یہ شخص بھی ہم سا ہی بے گناہ نہ ہو
اُٹھی تھیں ہم پہ بھی ایسے ہی اُنگلیاں یارو

تمہارے جسم سے جنگل کی باس آتی ہے
کہاں سے سیکھی ہیں یہ شہرداریاں یارو

کہاں گئے ہیں وہ ناداں جو اُن کے محرم تھے
کہاں گئی ہیں وہ خوابوں کی وادیاں یارو

○

زندگی! مجھ پہ یہ تہمت کہ میں ہرجائی ہوں
میں تو شیدا ہوں ترا، تیرا ہی سودائی ہوں

غم کے سیلاب میں بہتی ہوئی بے بس آنکھو!
یوں نہ دیکھو مجھے! کیا میں بھی تماشائی ہوں؟

میرے سینے پہ نہیں لوحِ شہادت اے شہر!
پھر بھی میں تیرے لیے باعثِ رُسوائی ہوں

اُن کا الزام کہ ہمسائے کا قاتل ہوں میں
مجھ کو یہ زعم کہ میں عکسِ مسیحائی ہوں

آپ اس ساغرِ مے کو تو اُٹھا ہی لیجیے
میں تو بس زہرِ توجّہ کا تمنّائی ہوں

میری آواز نہ پہنچی ہے نہ پہنچے گی وہاں
میں تو ویرانے میں بجتی ہوئی شہنائی ہوں

مجھ پہ حاوی سہی اک ٹوٹتے تارے کا طلسم
پھر بھی ناداں میں نئی صبح کا شیدائی ہوں

○

پھر بن باس کا موسم آیا، پھر تہذیب کے پنکھ جلے
پھر انسان کی مٹی سوئی، پھر بن مانس جاگ اُٹھے

جانے کتنی بار یہ نگری، غم کی آگ میں بھسم ہوئی
پھر بھی اس پاشان پوری کے، پتھر برف سمان رہے

دیکھ کے یہ زہریلی فصلیں کیوں اتنے حیران ہو تم؟
تم نے ہی تو ان کھیتوں میں ناگوں کے پھن بوئے تھے

اس کو سانپوں سے ڈسواؤ اس پر بھیانک وار کرو
یہ نگری بیدار نہ ہوگی، اک بچھو کے کاٹے سے

او سنجیونی لانے والو! یہ تاخیر کا وقت نہیں
درد کی لنکا چیخ اٹھی ہے، زخموں کے انبار تلے

آئی گئیں کتنی تہذیبیں، اس دھرتی کے آنچل میں
لیکن ہیں آباد ابھی تک سائے بوڑھے برگد کے

نادان وقت کے ہاتھوں آخر، خاک اڑی، اُس ٹیلے کی
جس پر بیٹھ کے اُس جوگن نے، جیون کے وردان دیے!

○

تم کو جو بات بہت کڑوی لگی ہے یارو
وہی اک بات تو اس شخص نے کی ہے یارو

ایک دیوار تھی اس شہر میں محرم سر کی
اب وہ دیوار بھی بیگانہ ہوئی ہے یارو

آج پھر گھر کی طلب ضد نہ کہیں کر بیٹھے
آج پھر دشت میں وحشت کی کمی ہے یارو

دے گا کیا عطر بھی اُس جنّتی خوشبو کا جواب
جو مِرے گاؤں کی مٹّی میں بسی ہے یارو

کیوں گراں بار ہے تم پر یہ سنہری لمحہ
زندگی موڑ نیا کاٹ رہی ہے یارو

جانے یہ لوگ اُسے کون سے معنی بخشیں
ہم نے معصوم سی اک بات تو کی ہے یارو

آؤ دیکھیں وہ کہیں اپنا ہی ناداں تو نہیں
جس کو گھیرے ہوئے اک بھیڑ کھڑی ہے یارو

○

ٹوٹ گیا سورج کا جادو سانجھ بھئی گھر یاد آیا
بند ہوئے جب سارے مقتل پھر اپنا در یاد آیا

جس حیران کھنڈر میں ہم نے، غربت کے دن کاٹے تھے
گھر کی نرم فضا میں اس کا پتھر پتھر یاد آیا

وقت کی سنگ تراش جسارت تجھ سے آگے بڑھ نہ سکی
جس نے جو بھی سنگ تراشا تیرا پیکر یاد آیا

کالے دیو کی کالی نگری اپنی موت کی حامل تھی
راون کا سر دیکھ کے ہم کو رام کا لشکر یاد آیا

جس بیمار بھکاری سے ہم بچ نکلے تھے شام ڈھلے
رات اُسی کا دستِ سوالی ہم کو پیرا بر یاد آیا

کالے آج کے گہوارے میں جس بالک کی آنکھ کھلی
اس کی صورت دیکھ کے ہم کو کل کا محشر یاد آیا

ہم بھی تیرے شہر کو ناداں وادیٔ ایمن کہہ دیتے
لیکن اس کے چوراہے کا خونی منظر یاد آیا

○

فریب کھا کے فریبِ نظر کو سمجھے ہیں
ستم کے رُخ کو، ریا کے ہُنر کو سمجھے ہیں

رہِ حیات ہے پُر پیچ کس کو تھا معلوم
یہاں تک آئے تو اس رہ گزر کو سمجھے ہیں

صلہ یہ کم تو نہیں دشت میں بھٹکنے کا!
کہ گھر کو لَوٹ کے آئے تو گھر کو سمجھے ہیں

جو غم کی رات سے گزرے نہیں وہ کیا جانیں
جو دشتِ تیرہ سے نکلے سحر کو سمجھے ہیں

رہے ہیں زد میں جو طوفاں کی ہر نفس ناداں
وہی تو آبروئے بال و پر کو سمجھے ہیں

○

باندھئے رختِ سفر یں کیا، نہ کیا لے جائیے
جی میں آتا ہے کہ گھر کا گھر اُٹھا لے جائیے

راہ کی دُشواریوں کا بھی تقاضا ہے یہی
آپ اپنے ساتھ اپنی ہر خطا لے جائیے

وحشتیں خنجر بکف منڈلا رہی ہیں چار سُو
آئیے اپنی شرافت کا صِلہ لے جائیے

اب یدھشٹر کا کہا بھی سچ نہیں اس شہر میں
لاکھ مرگِ اشوستھاما کو اچھالے جائیے

اب نئے دردوں کا موسم ہے نیا دھنونتری
آپ ہیں شاید پرانے درد والے جائیے

میں تو ناداں ہُوں اُٹھاتے جاؤں گا ٹیڑھے سوال
آپ دانا ہیں مجھے دارالشفا لے جائیے

○

اور کیا ہے تیری بستی میں پریشانی مجھے
ہر قدم پر ٹوکتی ہے مرگ سامانی مجھے

دو پرندے ایک ہی پتھر سے مارے وقت نے
آگ بستی کو عطا کی، آنکھ کا پانی مجھے

جس کا وعدہ تھا کہ پہنائے گا تاروں کی قبا
جاتے جاتے دے گیا ملبوسِ عُریانی مجھے

میں ترا گھوڑا بنوں اور آگ کو شبنم کہوں
جی نہیں منظور اپنی فاتحہ خوانی مجھے

آئینہ اور اپنی صورت یہ ہے تیری کائنات
کیا کرے گا مشتعل اپنا ہی زندانی مجھے

میرا چپ رہنا بھی اے ناداں بہت مہنگا پڑا
بخش دی قاتل نے مقتل کی نگہبانی مجھے

○

گھُٹی گھُٹی سی فضا، یہ رُکی رُکی سی ہوا
ہے پیش خیمہ کسی تند و تیز طوفاں کا

یہ شورشیں، یہ تصادم، یہ حادثوں کا ہجوم
یہ سب ادھر ہیں، اُدھر آدمی کا دل تنہا

مناؤ خیر سکوں کی، سکوں کے متوالو!
کنارے توڑ چکا اضطراب کا دریا

یہ حوصلوں کی کمی ہی تو ہم کو لے ڈوبی
بھنور سے ورنہ کناروں کا فاصلہ کیا تھا

ہزار غم ہیں ابھی منتظر ترے ناداں
ابھی سے کیوں تو دلِ زار لے کے بیٹھ گیا

○

شامل مری خطا میں تھی شاید تری رضا
ورنہ ذرا سی بھول کی اتنی کڑی سزا

رشکِ جناں سہی مِری منزل کی چاندنی
لیکن وہ دھوپ جس کا تعلق سفر سے تھا

آیا ہوں روند روند کے اک اک حریف کو
ورنہ خوشی سے کس نے مجھے راستہ دیا

تیری طرح وہ دشت بھی مجھ کو عزیز ہے
نکلا ہے جس کے دل سے ترے گھر کا راستہ

اے دشتِ غم کے ساکنو! تم تو مِری سنو
مارا ہوا ہوں میں بھی شبِ انتقام کا

ناداں امیرِ شہر کے حربے عجیب تھے
شاید قلندری نے بھرم تیرا رکھ لیا

○

ترے مزاج کی دنیا عجیب دنیا ہے
ابھی ہے رات کا آنچل ابھی سویرا ہے

نہ جانے کون سے محشر کو کل جنم دے گا
جو درد مجھ کو تمنا نے آج بخشا ہے

وہ چاندنی جسے تہذیبِ نفس کہتے ہیں
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ بڑا اندھیرا ہے

میں شہرِ درد کی تصویر کس طرح کھینچوں
کہ میری آنکھ پہ خوش فہمیوں کا پردا ہے

فلک کی سمت نہ دیکھو دکھوں سے گھبرا کر
زمیں کی بات زمیں تک رہے تو اچھا ہے

جہاں اُمید نے یاروں کا ساتھ چھوڑا تھا
یہ راستہ اُسی اندھی گلی سے نکلا ہے

تمہارے گھر میں ہے بس کام کی یہی اِک شے
یہ طاق! جس پہ تمہارا خلوص رکھا ہے

بہت قریب سے دیکھا ہے ہم نے ناداں کو
مگر وہ آج بھی کچھ اجنبی سا لگتا ہے

○

مجرم ہیں اگر ہم نے ترا نام لیا ہے
ہم نے تو فقط شکوۂ حالات کیا ہے

یہ زخم، یہ چیخیں، یہ برستی ہوئی آنکھیں
وہ کیسا مسیحا ہے؟ جو یوں جلوہ نُما ہے

وہ لوگ ہیں کیوں پیاس کی تہذیب کے خالق
دریاؤں کا تحفہ جنہیں ورثے میں ملا ہے

اے کشتیٔ زرکار میں بیٹھے ہوئے لوگو!
اُس سمت بھی دیکھو تو! کوئی ڈوب رہا ہے

اُس شخص کے دل میں ہے نہاں کون سا طوفان
آواز کے موسم میں جو چُپ چاپ کھڑا ہے

کچھ تُو ہی بتا اے شبِ ہجراں کی سیاہی
نکلا نہیں خورشید کہ پھر ڈوب گیا ہے

کس آس پہ پُوجے گا بُتوں کو کوئی ناداں
اس دَور نے ہر بُت کا بھرم توڑ دیا ہے

○

ڈھونڈنا شرط اگر ہے تو برابر ڈھونڈو
جس نے لنکا کو جلایا تھا وہ بندر ڈھونڈو

آج مرکوز ہیں دنیا کی نگاہیں تم پر
عیب پوشی کے لیے کوئی تو زیور ڈھونڈو

اپنے ہمسائے کے سینے میں اُتارو خنجر
اور پھر خود میں مسیحائی کا جوہر ڈھونڈو

ہیں مرے زخم تمہارے لیے پیغامِ حیات
ان کی تہذیب کی خاطر کوئی نشتر ڈھونڈو

تم نہ سمجھو گے کبھی وقت کے پورس کا جواب
جاؤ بابل کے مزاروں میں سکندر ڈھونڈو

ہے تقاضا بھی یہی پیاس نگر کا ناداں
پی گیا جس کو ہمالہ وہ سمندر ڈھونڈو

○

کل جسے سُن کے بھری بزم کا دل ٹوٹ گیا
ہم نشیں! وہ مرے احساس کا افسانہ تھا

کیا بتا پائے گا وہ شامِ غریباں کیا ہے
گھر سے باہر نہ کبھی جھانک کے جس نے دیکھا

کیا بلا ہوتی ہے پت جھڑ؟ یہ تو ہم سے پُوچھو
جب کبھی آئی بہار اپنا ہی گھر صحرا تھا

غم سے بچنے کے لیے بھیس ہزاروں بدلے
لیکن اس نے ہمیں ہر بھیس میں پہچان لیا

یاد آتی تو ہے کچھ شکل خوشی کی ہم کو
شاید اُس کو کبھی سپنے میں کہیں دیکھا تھا

غم نہیں ہے جو ترستے رہے انصاف کو ہم
یہ خوشی ہے کہ کوئی آپ سا منصف تو ملا

یوں تو اُس بزم میں سب کچھ تھا مگر اے نادان
تیری تسکین کی خاطر تو وہاں کچھ بھی نہ تھا

○

کس بات نے آخر اُسے مجبور کیا ہے
جینے پہ جو مرتا تھا وہ مرنے پہ تُلا ہے

زُلفوں کی گھنی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے لمحو!
یہ دُھوپ تمہارے ہی گناہوں کی سزا ہے

جائیں تو کدھر جائیں یہ ٹوٹے ہوئے پتّے
اِس رُخ کی ہوا ہے، کبھی اُس رُخ کی ہوا ہے

اب کیا ہوئے وہ عید منانے کے ارادے
کیوں چاند نظر آتے ہی دل ڈوب رہا ہے

ٹوٹا ہے کوئی قہر ہی ان تشنہ لبوں پر
اک جام پہ ورنہ کبھی ایمان بِکا ہے

نادان کہاں ملتا ہے ہر درد کا درماں
دل ہی کو نہ لے بیٹھے جو یہ درد اُٹھا ہے

○

اہلِ کمال رہ گئے نقش و نگار تک
اُن کی نظر کہاں گئی دل کے غبار تک

نیچا مکان، اونچے ارادوں کی موت تھا
پہنچا نہ ایک تیر بھی اپنے شکار تک

لکھی ہیں اپنے نام یہ اندھی مسافتیں
ہے روشنی کا دائرہ گرتے سوار تک

اُترے گا کون جلتی ہوئی آگ میں یہاں
محدود ہیں محبّتیں رقصِ شرار تک

جانے وہ گُل کھلائے گا کیا دشتِ یاس میں
ہے دَوڑ اعتقاد کی جس گُل عذار تک

ناداں یہ جوئے بار حریفِ انا تو ہے
جینا ہے پھر بھی آمدِ ابرِ بہار تک

○

بار ہا ٹوٹ کر بنا ہوں میں
ڈوبتی ناؤ کی انا ہوں میں

خود ہی ملزم ہوں، خود ہی منصف بھی
اپنے ہی روبرو کھڑا ہوں میں

میری مٹّی بھی کیا عجب شے ہے
برف باری ہے جل رہا ہوں میں

جن پہ رنج و الم کے پہرے ہیں
ان گھروندوں کا مدّعا ہوں میں

جس طرف سے بھی آئے، آئے ہوا
اپنے گھر کی طرح کھُلا ہوں میں

پھر رہا ہوں ازل سے خانہ بدوش
کس بگولے کی انتہا ہوں میں

حرف آئے گا مجھ پہ کیا ناداں
ایک درویش کی صدا ہوں میں

○

بے بس ہیں ہم کچھ ایسے اس غم کے ہجوم سے
دستک کبھی جو آس نے دی پٹ نہ کھُل سکے

اِس سمت چاندنی، اُدھر پُرسحر تیرگی
اور ہم ہیں اس دوراہے پہ بے بس کھڑے ہوئے

دل ڈوبتا ہے سُن کے یہ شورِ انانیت
بے لَوث زندگی! تو کہاں ہے صدا تو دے

اے شب گزیدہ! اب کسی سُورج کو دے صدا
انجم تو وقفِ زینتِ شب ہو کے رہ گئے

وہ زعفراں کی گھاٹی ہے مُدّت سے منتظر
لیکن یہ خارزار مجھے راستہ بھی دے

ناداں! کب اُس مقام پہ پہنچیں گے اہلِ دل
کب وقفِ دار ہوں گے یہ جلّاد فاصلے

اندر سروپ دت ناداںؔ کی ولادت ۲۷ نومبر ۱۹۲۷ء کو ضلع کیمبل پور (پاکستان) کے موضع ٹھی دتاں میں ہوئی۔ تعلق زمیندار گھرانے سے تھا۔ لیکن زمینداری کے کام کاج میں استحصال کے عمل دخل سے اس طرح بیزار ہوئے کہ گھر بار چھوڑ کر راولپنڈی چلے آئے اور ہوائی فوج میں ملازمت اختیار کرلی۔ شادی ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ مقابلے کے امتحانات نیز اپنی ذاتی قابلیت اور صلاحیت سے ترقی کرتے ہوئے بھارت سرکار کے ڈپٹی سکریٹری مقرر ہوئے۔

اردو ادب سے دلچسپی ابتدا ہی سے رہی۔ شروع میں کہانیاں لکھیں۔ ۱۹۶۳ء میں شاعری کرنے لگے۔ پہلا مجموعہ "غبار رنگ" ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔

ناداںؔ حد درجہ حساس واقع ہوئے ہیں۔ فکر، نظر اور مشرب کی کشادگی ان کی شخصیت اور شاعری کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ انسان دوست اور انسانیت دوست ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ زیادتیوں، دست اندازیوں اور استحصال کو دیکھ کر ان کی روح تڑپ اٹھتی ہے۔ وہ حالات اور کوائف کا گہرا سماجی اور سیاسی شعور رکھتے ہیں۔ تاہم اپنی شاعری کو کسی ازم کا تابع نہیں بناتے۔ علامتی اور تمثیلی پیرائے میں تخلیق ہوئی ان کی نظموں میں گہرے پیچیدہ سیاسی اور سماجی مسئلوں کی سرسراہٹیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ ذرا توجہ کریں تو لفظوں پر چڑھی ہوئی مٹھاس کی پرت الگ ہوجاتی ہے۔ اور منہ میں ایک گوارا کڑواہٹ گھل جاتی ہے۔ ان کے مفہوم و معانی کی کھنک سنجیدہ قاری کو تادیر بے چین رکھتی ہے۔ ان کے فکر و احساس میں کارفرما دردمندی کا جذبہ ہمہ گیر ہے افکار کا ایسا بامقصد اظہار حالیہ شاعری میں کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اور یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے جو ناداںؔ کو اس کے ہم عصروں سے ممیز کرتی اور ممتاز بناتی ہے۔

راج نرائن رازؔ